

”یہ بتانے سے کیا فرق پڑے گا؟“

”بہت فرق پڑے گا، رکا، پھر لولا：“

”میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے۔ اُسی وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ میں اکیس کے پیٹھے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئندہ دیکھا تو میرے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں ہیرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔“

چپ ہوا اور ملا گیا۔ یہ دیکھنے لیشیر کر اس کی بات کا کیا اثر ہوا۔ اسے جیسے جو کہتا تھا اس نے کہہ دیا تھا۔ اب سکون کے ساتھ اپنے گوشے میں جا پہنچا تھا اور عیدل کو ملتے کا آڑڈے سے رہا تھا۔

باہر کھڑکی سے جہان کا کہ جماں سامنے والا میدان لکھنی را توں کے بعد خالی اور خاموش نظر آیا تھا۔ چلو اچھا ہوا۔ روز جلسہ، روز جلسہ۔ اٹھیان کے سانس کے ساتھ بستر سے پھیٹھ رکھاتی۔ آج سکون سے سویا جا سکے گا۔ ایک کروٹ، دوسرا کروٹ، پھر کروٹ۔ نیند اس کی انکھوں سے آج کو سوں دور تھی۔ کروٹ لیٹنے کی خواہش پر تابو پاکر دیتا، آنکھیں موندے سے چب پڑا، با جیسے اب سویا اور اب سویا۔ مگر ہم بولے جا رہا تھا۔ کہاں کہاں کی بات، کب کب کے قصے۔ کوئی اب کی، کوئی زمانوں پہلے کی۔ میں نے آج جیسے تیسے قلع پر ٹھیٹھ ختم کر دیا تا رخ پڑھانا بوریت کا کام ہے اور تاریخ پڑھنا ہم کے بے ڈھب سوال کرتے ہیں اور ذہن ہے ایک لڑکا کھڑا ہوا:

”سر۔“

”مال پوچھو۔“

”سر اکیا مغلوب میں سب بھائی سوتیلے بھائی ہوتے تھے۔“

”پیڑھ جاؤ۔ تمہیں اس ساری تاریخ میں سے یہی بات پوچھنے کی نظر آتی؟“

میں نے اسے ڈانٹ کر بٹھایا ہے معنی سوال سئے اور سوتیلے کی تعریف یہ معنی یافت ہے
ہابیل اور قابیل سوتیلے بھائی ہیں تھے تاریخ میں اور تاریخ سے پہلے۔ اساطیر، قصہ،
حکایتیں، بھائیوں کی کہانیاں۔ وہ جہنوں نے یا پکے جدیتے ہی۔ وہ جو ہاپکے مرغی
کے بعد۔ اب سونا چالیسیتے۔ آخر صبح کالمج یا نہ ہے۔ پھر وہی سمجھت تاریخ۔ لڑکوں کو تاریخ
پڑھانا کتنا بور کام ہے اور تاریخ پڑھنا؟ دوسروں کی تاریخ اطہیناں سے پڑھی جاسکتی ہے
جیسیے ناول اطہیناں سے پڑھا جاسکتا ہے۔ مگر اپنی تاریخ؟ میں اپنی تاریخ سے بجا گا ہوا ہوں اور
زمانہ حال میں سانس لے رہا ہوں۔ فراریت پستہ۔ مگر یہ رحم حال پھر ہمیں تاریخ کی طرف
ڈھکیل دیتا ہے۔ ذہن بولے جا رہا ہے۔ آپ میرے سر کے یاں دیکھ رہے ہیں؟ دیکھ رہا ہوں
سیب سفید ہیں۔ عرقان نے اس غریب کے سیدھے سادھے سوال کا جواب کئے ترشیج ہیں یا
تھا۔ بتانا چاہتا ہوں سفید کیسے ہوتے۔ پاکستان پہنچا تو میرا سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔
پاکستان میں اس شخص کا پہلا دن، اور میرا پہلا دن بیرون پہلا دن پاکستان میں۔

اس شخص نے غسل کیا اور آئینہ دیکھا، اور اس پر ہمیں کھلا کہ اس کے سر کے بال کہ گھر سے
نکلتے وقت سارے بیاہ تھے، اب سارے سفید ہو چکے ہیں۔ یہ اس دیوار میں اس شخص کا پہلا دن تھا۔
اور میرا پہلا دن؟ بیلیتے دن اس کے تصویر میں بحوم کہرتے چلے گئے، مگر مجھے تو اس دیوار میں اپنے
پہلے دن کی تلاش ہے وہ بحوم کو چیرتا چھاڑتا نماز عذر کرتے دونوں کو دھکیلتا بڑھے چلا گیا میرا
پہلا دن کہاں ہے؟ وہ بحوم کو چیرتا چلا جا رہا تھا کہ دھنڈ لی باد کی صورت، ایک دن
اس کے سامنے آگھر ابھوا۔ انارکلی بازار کچھ کھلا کچھ بیند جہاں تھاں کوئی دکان کھل ہوتی،
باقیوں میں تالے پڑے ہوتے بحوم بہت اخیری ارجاع تھے۔ وہ وہاں سے نکل کر بڑی سڑک
پر آیا۔ مال روٹ ناتھگے، سائیکلیں، کوئی کوئی کار، وقفے وقفے سے گزرتی ہوئی آکاڈ کا
لیں۔ ایک دراز قامت شخص، چوڑی جکلی کا بھٹی، سر پھرے والی پکڑی مانگوں میں
بڑی ٹھیر والی شلوار بیٹھے ڈگ بھترنا اس کے بہادر سے گزرتا۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔
پھر کتنے ہی اس قدر کا ٹھڈے والے ایسا بابا اس پہنچے اپنے آس پاس چلتے پھر تھا۔
یہ شکلیں اس کے لئے تی تھیں۔ اس کے لئے سدا ارادگرد ہی بیبا تھا۔ چلتے ہوئے لگ رہا
تھا کہ وہ کسی نئی زمین پر چل رہا ہے۔ اس سے اس نئی زمین پر خلٹے میں کھنی لذت مل رہی تھی۔
ایک سڑک سے دوسری سڑک پر، دوسری سڑک سے تیسرا سڑک پر جانے وہ کتنی دیر
چلتا رہا، مگر ذرا بوجھ کا ہو۔ کتنے زمانے بعد وہ آزاد اتھا چل رہا تھا۔ اس اندر یعنی کے بغیر کہ

ابھی کوئی برایر سے گورتے گزرتے پھر اس کے اندر تار دے گا۔

« صابرزادے اسارے دن کماں رہے؟ »

« حکم جی پاکستان دیکھ رہا تھا۔ »

« اب اور کیا دیکھنا ہا ہے، پاکستان ہی کو دیکھنا ہے۔ اتنی محبت کیا ہے۔ دوپہر کو کہہ

کہاں کم کھانا تو کھالیا ہوتا۔ »

پھر حکم جی ابا جان سے بالوں میں صرف ہو گئے اس نے کھان لکھایا اور اس کمرے میں جا کر لیٹ رہا جہاں اسے سونا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتنا صاف ستمرا اونٹ شادہ کمرہ تھا اور کتنا روشن تھا۔ چار کوٹوں میں چار بیب لگے ہوتے تھے۔ یہاں پہلے کون رہتا ہو گا، یونہی اسے خیال آیا۔ اسی کے ساتھ اسے اپنے کمرے کا خیال آیا، بدرنگ دلواروں والا چھوٹا سامکھہ جس میں ایک چار پائی ہیں۔ کتابوں سے بھری ایک بیڑتکتابوں کے بیچ میں رکھا ہوا ایک لمبی لمبی روشنی میں وہ رات گئے تک پڑھا کر تاخاہیر ایک رات غالی پڑا ہو گا۔ اس بڑے اور روشن کمرے میں لیٹھ ہوتے اسے وہ اپنا چکوڑا ہوا خستہ حال کرہ بہت یاد آیا۔ آنکھوں میں اتری نیند غائب ہو گئی۔ دیر تک وہ کروٹیں پیدلتارہ ادا جان کے کھانستے کی آواز سن کر وہ بھر دیکھ آئے؟ اسے ان کے آئے کا پتہ ہی نہ چلا۔ خیروہ دیر تک دم سادھے پڑا رہا جیسے سوگیا، مگر نیند کھاں۔ اسی اپنے کمرے کا تصور بن دھا ہوا تھا۔ پھر اس نے منہ پر چادر لے لی اور وہ رو دیا۔

« ذاکر، جاگ رہے ہو؟ »

« جی، » اس نے کوشش کی کہ اس کی آواز سے اس کے حال کا پتہ نہ چلے۔

پھر دیر تک وہ دم سادھے پیدلتارہ جیسے سوگیا ہے۔ جلنے کتنی دیر تک وہ اسی طور لیٹا رہا۔ آخر اس نے کروٹ بدلی۔ مخنوڑی ہی دیہ بعد دوسرا کروٹ لی۔ پھر اٹھا،

پانی پیا، پھر سبیت رہا۔

«ڈاکٹر!»

«جی۔» وہ سمجھ رہا تھا کہ ایسا جان سو گئے ہیں مگر وہ تو جاگ رہے تھے۔

«کیا بات ہے، سوتے نہیں؟ کل رات یہر کے چال گئے ہوتے ہو۔ سو جاؤ۔»

«نیند نہیں آ رہی۔»

«ہاں نئی جگہ ہے اور پہلی رات ہے۔» ایک تالی کے ساتھ کہا۔

چپ ہوتے، پھر لوٹے۔

«ایس سے پہلے بھی میرے ساتھ بھی ہوا کہ کبھی کسی نئی جگہ گیا تو پہلی رات تو بالکل نیند نہیں آئی۔»

اس نے چارہ منہ پر لے لی، اس کی آنکھ پھر بھرائی ہتی۔

وہ رات اپنی بے خوابی کے ساتھ اس کے تصور میں منور ہوتی چلی جا رہی ہتی۔ وہ دن معد اپنی رات کے اس کی گرفت میں تھا۔ تو یہ تھا اس دیاہ میں میرا پلا دن۔ میں دن بھر ایک تازہ نہیں پہ ایک تازہ آسمان تک خوبشی سے سرشار چلتا رہا۔ پھر رات آئی اور میری بے نیند آنکھیں آنسوؤں سے تربہ تر ہو گئیں۔

وہ دن اسے بہت پاکیزہ نظر آیا، اپنی رات سبیت، اپنے اس رات کے آنسوؤں سبیت۔ اس دن کو میں بھول گیا تھا، اسے قبیب ہوا، اتنے اجلے دن کو اس کے بعد تو دن میلے ہتی ہوتے چلے گئے۔ شاید بھی ہوا کرتا ہے۔ دن گزرنے پلے جاتے ہیں اور پہلے دن کی پاکیزگی گردش ایام میں زائل ہوتی چلتی ہے۔ کئی جلدی ہمارے دنوں کی پاکیزگی زائل ہو گئی ہتی۔ جلدی ہماری رانوں سے ٹھنڈک رخصت ہو گئی۔ مگر نیروہ ایک دن، اس دیاہ میں میرا پلا دن وہ میرے عافیت میں منور رہنا چاہیے۔ سگرہ اس خیال کے ساتھ کچھ اس پاس کے دن بھی منور ہو گئے اور اس ایک دن کے گرد آنکھے ہوتے چلے گئے۔ منور دنوں کا ایک جھرمٹ۔ سا

بن گیا۔ جب پاکستان ابھی نیا نہ تھا، جب پاکستان کا اسلام نازدہ تھا۔ روپ نگہ کے آسمان کی طرح، اور زمین ابھی میل نہیں ہوئی تھی۔ کس طرح ان دونوں قافلے کا کے کوسون چل کر یہاں پہنچ رہے تھے۔ روز کوئی قافلہ شہر میں داخل ہوتا اور گلیوں مخلوں میں بکھر جاتا۔ جسے یہاں سرچھانے کے لئے کوئہ مل گیا وہاں پس رکھا جاتا۔ جسے کشا دہ مکان میسر کیا جاتا وہ پھر اپنی خوشی سے پھر مروت میں آتے والوں کو پناہ دیتا چلا جاتا، یہاں تک کہ وہ کشا دہ مکان تک نظر آنے لگتا پناہ لینے والے پوری داستان سنلتے کہ سفر میں کیسے کیسے رنج انہوں نے کھینچے اور کم مشکلوں سے یہاں پہنچے۔ پھر ان کا حال سنلتے ہے جنہیں وہ یتھے چھوڑ آئے تھے۔ پھر یہاں دینے والے اور پناہ لینے والے مل کر انہیں باور کرتے ہجتوں نے زین پکڑی اور اپنے گھروں کو اور بزرگوں کی قبروں کو نہیں چھوڑا۔ انہیں دھیان میں لاتے جو ساختہ سامنے نکلے تھے مگر سے میں پھر گئے اور جنہیں وہ اجلبی را ہوں میں بے گور و کفن چھوڑ آتے۔ وہ مل کر ان سیب یتھے رہ جانے والوں کو ایک مل کے سامنے یاد کرتے۔ وہ ان کے پھر آتے اور آنکھیں ڈبڈبا نے لگتیں۔ پھر اسکیں پوچھتے اور اگلے دونوں کی سوچ پتے کہ یہاں کیسے گز دیس کرنی ہے۔

آن ملنے والے کس کس رنگ میں آن کر ملتے۔ کبھی پہلتے چلتے بازار میں ٹھبیری، ہو گئی۔

”اماں، تمہارا،“

”چیبا، والی جیتنے کا دھرم نہیں رہا تھا سوچا کہ اُستاد بیان سے نکل چلو۔ بس بستر پاندھا اور سپیشل میں بیٹھ لیا۔“

کبھی اچانک دروازے پر دشک ہوتی۔ دروازہ کھلنے پر کبھی سامان اور سواریوں کے لئے پختہ اتنا لگہ کھڑا نظر آتا، کبھی اکیلا آدمی رہے سروسامان، بیاس میلا کچیلا، سرپیں گرد اپنی ہوئی، شیوپڑھی ہوئی۔ پہلی نظر میں صورت پہچاننے میں نہ آتی۔ جب پہچانی جاتی تو آنکھیں حیرت زدہ ہو کر ”کیھیں“ اسے تم ہو؟، یہ ساختہ بغل گیر ہونا سوال پر سوال کرنا کیسے آتے؟ رستے میں خیرست رہی؛ باقی لوگ کہاں ہیں؟ کیا اکیلے چلے تھے سامان

کہاں ہے؟“

”خیریت کیسی؟ مڑیں پر جملہ ہو گیا تھا۔“

”اللہ خیر کسے، پھر؟“

”بس اللہ نے خیری کی، جان اور آبیر و رکھ لی ورنہ کوئی کسر تو نہیں رہ گئی تھی۔“

”واللہ تیراشکس ہے، پھر باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”واللہ کیمپ میں ہیں۔“

”میاں جب گھر موجود ہے تو کیمپ میں کیوں پڑے ہو؟“

”یہی سوچا تھا کہ پہلے معلوم کر لیں کہ گھر میں کچھ گنجائش بھی ہے۔“

”میاں دلوں میں گنجائش ہوں چاہیے۔“

گنجائش ویسے مکانوں میں بھی کم نہیں تھی۔ شام تک بھیں کتنے مکان خالی پڑے تھے۔
کتنے مکان تھے کہ کھلے پڑے تھے۔ دروازے اور در پیچے سب کھلے ہوتے، کھلے دی چوں
سے گھر میں بھر اساز و سامان لظر آتا ہوا۔ لگتا تھا کہ جانے والے بس اچانک دامن جھاڑ کے
امکھڑے ہوتے اور کھل گئے ایسے بھی مکان تھے۔ جن میں موٹے موٹے تالے پڑے تھے۔
اوپر پیچے کے سب در پیچے احتیاط سے بند کئے ہوتے۔ لگتا تھا کہ جانے والے والپی کے
خیال سے گھروں کو بند کر کے لمبے سفر پیکتے ہیں۔ کسی کسی گھر کی بالاتی منزل کا کوئی در پیچہ
بے دھیانی میں کھلا رہ گیا تھا اور اب جب ہواتر چلتی تھی تو دی پیچے کے کھلتے بند ہوتے پڑتے
دھاڑ دھاڑ بولتے تھے۔ کوئی کوئی عمارت ادھر بنی پڑی تھی، کوئی تعمیر کے آخری
مرحلے میں آگہ جہاں کی تھاں رہ گئی تھی۔ ان عمارتوں والے دور کے شروں میں سرچھپانے
کے لئے کوئے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے۔ دور کے شروں سے آنے والے ان عمارتوں
میں سرچھپانے کے لئے ٹاگ و دوکر تے پھرتے بیٹھے۔ ان عمارتوں میں بہت گنجائش تھی۔
ان عمارتوں سے زیادہ دلوں میں گنجائش تھی۔ حکیم بندے علی نے اپنے مقبوضہ دو منزلہ

مکان میں کتنے گھر ان کو پناہ دے رکھی تھی۔ نتوالس وقت پہنچا جب دونوں منزليں بھر
چکی تھیں:-

”حکمر جی! میں توجی تمہارے اس باہر کے براہمے میں پڑ رہوں گا۔“

”ہاں ہاں شوق سے، حافظہ میں کیا جھٹت ہے۔“

نواتے اپنے بیٹے کے ساتھ اس باہر کے براہمے میں ڈیرے ٹال دیتے۔

وہ دن اپھے ہی تھے، اپھے اور سچے۔ تجھے وہ دن یاد رکھتے چاہیں، بلکہ فلمینگ کر لیئے چاہیں کہ بادا ذہن سے چھڑا جائیں اور بعد کے دن؟ انہیں بھی کہ پتہ چلے کہ کیوں کہ دلوں سے اچھائی اور سچائی معلوم ہوتی چلی گئی، کیوں کہ دلوں سے خوست اور راتوں سے رہشت وابستہ ہوتی چلی گئی۔ کس طرح دیکھتے دیکھتے شام بگر کے مکان کشادہ سے شگ ہوتے چلے گئے اور دلوں میں گنجائش کم ہوتی چلی گئی۔ قافلوں کا تاثنا لوٹ پڑا تھا۔ اس کبھی کوئی اکاڈمی فرد، کبھی کوئی چھوٹا موڑا خاندان آنکھتا، شام بگر میں بھکتا پھرتا۔ کہیں سرچھپا نے کی جگہ نہ ملتی۔ شام بگر کے سب مکان ہیر چکے تھے، بوکھلے پڑے سے تھے وہ بھی جو مغلل تھے وہ بھی بجادرہ ہے زمگنے تھے وہ بھی جس مغل عمارت کا ایک بالائی دریچہ کھلا رہ گیا تھا اور دوپھروں اور راتوں کو تیز ہوا چلنے پر ایک ڈراؤنے سور کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا تھا، اب اس کے صدر دروازے سے بچے اور جوان آتے جلتے نظر آتے اور اس بالائی دریچے پر ایک چتی پڑی دھکائی دیتی تھی۔ بالائی منزلوں کے دریخوں پر کہیں چھین پڑتی تھیں، کہیں زیگیں پر دے، کہیں ٹاٹ۔ اور بچی منڈپوں پر کہ کل تک ویران تھیں زمگ بر زمگ گیلے کپڑے پھیلے نظر آتے۔ اس سفید اندازی عمارت میں جس کے پوپٹ کھلے دروازے اندر کے فرشٹہ کمروں کا پتہ دیتے تھے اب باہر کے چپ والے براہمے میں بھیں بندھی نظر آتی تھی اور ڈر انگ رو میں نقشہ یہ دھکائی پڑتا تھا کہ فرنچیز ایک طرف ڈھیر کیا ہوا تھا، باقی جگہ میں بھروسے اور اپنے کے ڈھیر شام بگر میں بے سروسامانی

فائفش اب نہیں تھا۔ زندگی کی ضرورتیں کہ بحیرت میں حضور ہوتے ہوئے تن ڈھانکنے اور پیٹ
بھرنے تک محدود ہو گئی تھیں، اب پھر بڑھ کرہ بھیل کی تھیں اور بڑھتی بھیلی چلی جا رہی تھیں۔
جن مکانوں نے کئی تک خاندانوں کو پناہ دی اب وہ مکان باقی خاندانوں سے گلوخلاصی حاصل
کر کے کسی ایک خاندان کی رہائش گاہ تھے مگر اس کے باوصت اب ان میں مکانیست کم اور
مکینوں کی ضروریات زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ جن مکانوں میں ہتوڑ مختلف خاندان ٹھنڈے
ہوئے تھے ان میں ہر خاندان اپنی ضروریات زندگی میں اضافہ کرنے کے سامنہ ساختہ
بھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی میں بھیلی پھیلیتے پھیلیتے اپنی حدود سے نکل کر دوسرے کی
حدوں میں بھیلنے پر مائل نظر آتا۔ دوسری طرف سے مزاحمت ہوتی۔ تو نکار، پھر ایک کا ہاتھ
اور دوسرے کا گھر بیان۔ لمحے نے دالے پہلے اندر اندر رُطتے پھر رُطتے لٹتے باہر نکل آتے
ہمسائے پہلے تو تماشہ دیکھتے۔ پھر زیج بچاؤ کرتے۔ کوئی پھر تیلا مکین بھاگ دوڑ کر کے
پورا مکان اپنے قام الات کردا۔ پھر باقی مکین ٹانڈا ٹانڈا لااد کرنے نے ٹھکانے کی تلاش
میں نکلتے۔ جس نے نکلنے میں پس و پیش کیا وہ مھانے کپھری میں کھنچا کھنچا پھرا۔
” حکیم جی اکیا شوا علا گیا یاں سے؟ ” میں نے اس بیلامدے کو جہاں اب ایک ٹھنڈے
بچلے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا بحیرت سے دیکھا اور نقل کرے میں جا کر کہ حکیم بندے علی
کا مطلب منفا سوال کیا۔

” نہ ہاتا تو کیا کہرنا ، پولیس اگر کہہ تو نہ چاندے سڑک پر پھینکنے لگی تھی۔ ” چب
ہوتے پھر بولے:

” وہم بھی مکان کی تلاش میں ہیں۔ ”

” آپ! ”

” ہاں میاں میں، پولیس کے ہاتھوں یہ عورت ہونے سے یہ اچھا ہے کہ آدمی خود
ہی اُکٹھ جاتے۔ ”

”مگر پہلے تو آپ ہی اس مکان میں آئے تھے، آپ ہی نے ہم سب کو پناہ دی تھی۔“
”بیٹھے سوتے کی کلیا جاگئے ماں کلٹا۔ منشی مصیب حسین ہماگ دوڑ کر کے اپنے نام کا
آڑڈلے آئے ہیں۔“ رکے، بڑے ”اس کی آنکھیں میں سور کا بال ہے۔ وہ کسی کو یہاں لکھنے
نہیں دے سکتا۔“

میں نے اندر جا کر فکر کیا ”ابا جان! نواز تو جلا گیا۔“

ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اور حکیم جی بھی مکان کی تلاش میں ہیں۔“

ابا جان نے جیسے ستاہی نہیں، ہاں اسی یوں ”تم مکان کب تلاش کرو سکے؟“
”زاپیں بھی نکلنے پڑے گا۔“

”کیوں تم میں کیا سر خاب کے پر لگے ہوتے ہیں۔“

”امی! یہ نشی وہاں تو ایسا نہیں تھا۔“

امی نے ٹھنڈا سا نس بھرا ”یاں آکے تو لوگوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا۔ تجھے تو کیا
یاد ہو گا جب تیرے دادا بانہ نہ تھے تو یہ منشی مصیب حسین ہماری ٹیوڑھی نہیں
چھوڑتے تھے۔ اللہ کی شان کہ اب ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔“

ابا جان نے اسی کو دیکھا کچھ ناخوش سی نظروں سے، پھر لوٹے ”والد مر حوم نے اپنے
وقت میں کس کس کو فیض نہیں پہنچایا، مگر کسی پر بتایا نہیں۔“

”ہم نے بھی کب کسی پر بتایا مگر جب جی بلتا ہے تو بات زبان پر آہی جاتی ہے۔
وال پر کیا اوقات تھی۔ یاں آکے گنجے کو ناخون مل گئے۔“

”فاکہ کی ماں“ ابا جان کے لیے میں سرزنش کا رنگ تھا ”اللہ تعالیٰ لاعز و رکر نے الون
کو پسند نہیں کرتا۔“

”ہاں مگر تم نے تو غور کبھی نہیں کیا تھا۔ خدا نے نہیں کتنا پسند کیا۔ آج سر چھپا نے

کے لئے کوئی کوتہ نہیں ہے، امی نے چلے بھنے لجھ میں کہا اور چپ ہو گئیں۔

بیں آہستہ سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس گھر سے نکل جانے کے خال نے مجھے کوئی ایسا پریشان نہیں کیا۔ اصل میں اس گھر کے دردیوار سے میں کچھ زیادہ مالوس نہیں ہو سکتا تھا اور جس کمرے میں میں نے اپنا بستر کو لا تھا، اس سے تو مجھے بالکل ہی اُنس نہیں تھا۔ مجھے اپنا چھوٹا ہوا کمرہ اکثر یاد آتا تھا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دم سے کتنی وقیعین گئی تھیں۔ کوئی غیر اہم سی یات کوئی نہیں سی چیز کبھی بیٹھے بیٹھے کبھی چلتے یاد آ جاتی۔ ایک منظر صور میں اُبھرتا، اس سے پیوست کوئی دوسرا منظر، پھر ان دونوں سے بالکل غیر متعلق، کوئی تیسرا منظر۔ یادیں لہروی کی مثال امنڈتی رہتیں اور میں ان میں پہنچا رہتا۔ اور وہ لہر جو ہر لہر میں شامل تھی اور لہروں کے سارے سلسلے کو منور کر رہی تھی۔ صابرہ۔۔۔ ہم آخری دونوں میں کتنے گھل مل گئے تھے اور جب میں اسے پہنچا رہوں گرے گیا تھا۔ اس کے ساتھ اپنا پہلا اور آخری سفر، ہم و یاس پور سے منہ اندر ھیرنے سکھتے تھے لیکن جب لاری بلند شہر جا کے رکی تو دوپھر ہو چکی تھی اور جب ہمارا اکا دوسرا سے اڈے پر جانس کے لئے جہاں سے روپ نگر کے لئے لاریاں چلتی ہیں۔ بازار سے گزر رہا تو بورا والوں کی گلی میں اتنا دھواں اور اتنے تند تھے کہ میرا دم گھنٹے رکا۔ اس نگر کی سیستانیں اپنی اسی رنگت سے تو پچانی جاتی ہیں۔ یہ رنگت ویاس پور کی رنگت سے کتنی مختلف تھی۔ دھواں، تندتہ، گڑ سلیں، گرف، بازار میں جہاں پنیٹھ لگتی وہاں کتنی گہرے سلیں ہوتی تھیں اور جس گلی میں بڑے بڑے چواموں پر شکر کے کڑھا و پڑھے نظر آتے وہاں کتنا دھواں اور تندتہ ہوتے تھے کہ گلی سے گزرنا مشکل ہوتا۔ بازار سے آگے جاؤ تو کنکن بچھی گرداؤ سڑکیں کہیں ہموار کہیں گڑھ پڑھے ہوئے روپ نگر کی لاری کہیں تیسرے پھر کو چلی ہے۔ گنگا کے پل سے گزرتے گزرتے اندر ھیرا ہو گیا۔ جانے کیسے، جانے کس وقت وہ ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ پھر میں اس راہ کی گرد

اور گرگھوں سے بے نیاز ہو گیا اور اس بات سے بھی کہ لاری کب روپ تک پہنچے گی اور پہنچے گی بھی یا نہیں۔

چلتے چلتے میں ٹھٹھا «افضال تم؟ یہاں تم کیا کر رہے ہو؟»
«دوستوں کے ساتھ ہمہ دی وی»

میں نے پکر کر ادھراً دھر دیکھا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں درخت تھے اور گرتے ہوتے زرد سوکھے پتے۔

«کون دوست؟»

«یہ سب درخت میرے دوست ہیں، آج وہ مشکل میں ہیں لگتا ہے کہ بالکل یہ سب
ہو جائیں گے۔»

میں وہیں گھاس پر افضال کے پڑا یہ ٹیکھا گیا پھر گرد و پیش کا جانزہ لیا۔

«یار موسم بالکل ہی بدلتا گیا، جب ہم آئتے تھے تو پہ سات ختم ہو رہی تھی۔

جاڑی سے شروع تھے، جاڑا بھی کیسا پڑتا ہے۔ الاماں!»

«ہاں پاکستان نے ایک موسم دیکھ لیا۔ اب اس پر دوسرا موسم گزر رہا ہے۔

اویہ موسم ذیادہ ظالم ہے، درخت یہ ہنہ ہو رہے ہیں۔»

«یار افضل! یونی میں نے پوچھ لیا «یہاں تم نہیں ہوتا؟»

«کیوں نہیں ہوتا، چلو میں نہیں دکھاؤں۔»

وہ مجھے اس باغ میں لئے لئے چھڑا۔ چھڑا ایک درخت کے سامنے چاکر کھڑا کر دیا۔ «یہ زہاں تھا رانیم۔»

میں نے عورت سے دیکھا «یار یہ تو بکاں ہے۔»

وہ اس پر ھٹوڑا اٹپٹا بیا۔ خیر کوئی بات نہیں، بکاں بھی برا نہیں ہوتا۔ میرا تو وہ

بھلی دوست ہے۔ نیم یہاں ہے، ڈھونڈ ناپڑے گا۔»

”مگر ہماری طرف اسے ڈھونڈنا نہیں پڑتا تھا، مل جلتی دوپر ویں میں اور ساون سے
چھینگے دونوں میں وہ خود اپنا اعلان کرتا تھا۔“

افضال چپ رہا۔ ایک ٹھنڈا بگ کے نیچے جا کر اس نے قیام کا اعلان کیا۔ یہاں
کھوڑا دم لو۔ یہ پاکستان کا سب سے ٹھنڈا گوشہ ہے۔“

”اچھا؟“ میں ہنس پڑا۔

”ہاں،“ افضل نے سخن دی سے کہا۔ اصل میں بیری آشنائی برگد سے زیادہ ہے۔
نیم تو زنانہ پیر ہے، اس کی شاخوں میں تو جھولا ہی فلاحا سکتے ہے یا پھر اس چھاؤں میں
بیٹھ کر بلوچیاں چڑھاتیں۔ بنوان تو برگد کی چھاؤں ہی میں ملتا ہے۔“

اس وقت برگد کے خلاف کچھ کتنا لکڑاں نعمت ہوتا۔ اس کی چھاؤں گھنی اور ٹھنڈی
؛ گھنی نیچے بچھی ہوتی تھاں، ہری ہری اور بنم نرم۔ میں نے جوتے اُنار کر الگ رکھے۔
اگر کہیاں کے بٹن کھوئے اور چوتی بیٹ کر اسکھیں موند لیں۔ مجھے اپنے گشیدہ پیڑا دا آر ہے
تھے۔ گشیدہ پیڑ، گشیدہ پرندے، گشیدہ ھوڑتین۔ نیم کے موٹے ٹھٹھے میں پڑا ہوا جھولا
صابرہ، میلے جھوٹنے، نیم کی بولی لکی، ساون کیب کیب آؤے گا۔ بوندوں سے
بھیگے کال پر گری ہوتی گلیں لٹٹ۔ جیو سے موری ماں کا جایا، ڈولی بھیج بلاوے گا۔
دور سے پیر سے آتی ہوتی کوئی کی آواز۔

نیم کا پیڑ بھی میں نے دریافت کر ہی لیا۔ کہ کوئی کی آواز پہلے سنی۔ اس دیوار
میں وہ میرا پہلے پہل کوئی کی آواز سنتا:

از کجا نی آبید ایں آوازِ دوست

بہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب ہم شام تکرے سے بخل کر کرائے کے مکان میں آباد ہوئے
یہاں آس پاس کوئی متروکہ مکان نہیں تھا، اس لئے اڑوس پڑوس میں کوئی نہ اجر گھرنا
بھی نہیں تھا۔ کھلی جیگے بھتی۔ ٹھوڑے فاصلے پر درخت اپھی خاصی تعداد میں کھڑے نظر

آئے ہے تھے۔ کوئی کی آواز سے میں نے شنگن لیا کہ ان میں ام جامن کے پیر طبیبی ہوں گے۔
کوئی کی آواز اسی نے سُنِ تعجب طرح چونکیں:

“آتے ہے! کوئی بول رہی ہے۔”

پھر بالکل چپ ہو گئیں۔ کان کوئی کی آواز پر لگے ہوتے اور پھر میں نے دیکھا کہ ان کی نکیں
بھیگنے لگی ہیں۔

کوئی کی آواز میرے لئے حکمتہ بحایات کا پروانہ بن گئی کہ اس کے بعد میں اس شہر
میں مستabal سا چلا گیا۔ مگر اسی کے یہاں اس آواز تے مختلف اثر کیا۔ سوئی ہوتی یادوں کو جگا
دیا۔ اور پر سے شریفین بوانا نازل ہو گئیں۔

“اسے شریفین بوا نامیں کیب آئیں۔” اور اسی اٹھ کر بے ساختہ ان سے گلے ملیں۔

دہن بنی! مجھے تو آتے ہوتے یہاں میتھ ہو گیا۔ ایسا جی چاہ رہ تھا تھیں دیکھنے کو۔
میں اتنا پالیتی شام نگہداں کے گھر میں پہنچی۔ مشنی مصیب حسین نے بتایا کہ مولا نا تو یاں سے
چلے گئے۔ یہ کہتے کہ انہوں نے مکان کااظروں ہی نظر و میں جائتے ہیا!

“دہن بنی! میں ابھی مشنی مصیب حسین کا گھر و نکیوں کے آرہی ہوں۔ جو بیلی ہے جو بیلی۔ تم
نے یہ کیا طبیطہ باشنا کام کان الائٹ کرایا ہے۔”

“میبا الائٹ کہاں کرایا ہے۔ ہم تو کہہ لئے کے مکان میں پڑھ سے ہیں۔”

“کہا تے کے مکان میں؟ دہن بنی! ہوش کی دوالوں نگوڑے نگھروں نے جو بیلیں
الائٹ کرایں، جو بیلی دالے کہا تے کے مکان میں پڑھ سے ہیں، پھر لمحہ بدل کے بولیں:

“بی بی! برامت ماینو، تمہارے پاکستان میں تو بہت آپا دھیاپی ہے۔ لوگوں
کے خون کیسے سفید ہوتے ہیں، میں تو دلکھ کے حق و قرہ گئی۔”

پھر فوراً ہی پیری طرف منوج رہو گئیں:

“و دہن بنی! یہ ذاکر ہے؟ اسے ہے میں نے تو اسے پہچانا ہی نہیں۔”

اُنھے کہ چٹ چٹ بلا لیں یہی :

«بیٹے تم نے مجھے نہیں پہچانا بنا؟ میں نے تمہارے پورے دھوئے ہیں اور جب تمہارے موڑی بھیرا لکلا تھا تو بی اماں کے سامنے میں رات رات بھر تمہارے سر پر لانے بیٹھی رہتی تھتی۔ دامن بی تھیں تو یاد ہو گائے»

«ہاں بیاد ہے۔ اس بیماری سے تو اس بیخڑہ ہی تھا کہ پس کچ گیا۔»

«بی اماں نے کم دعائیں نہیں رائجی تھیں۔ ہر وقت جانمان پر بیٹھی رہتی تھیں۔ تو یہی

کیا کہ رہے ہو؟»

«شریف بوا! تمہارا ذاکرہ کا لمحہ میں پہ وفیسر ہو گیا ہے۔»

«رمائے اللہ! خدا بارک کرے۔» چھڑک کے بو لیں:

«دامن میں افسوس مصیب حیین کے لونڈ سے کو دیکھ کے تو یہی ذمک رہ گئی؟ ان پر تو ڈنڈے بجا تھا۔ وہ نکھل دیاں آکے تو دونوں ہاتھوں سے گمراہ ہے؟

«کمانے والے بیان دونوں ہاتھوں ہی سے کہا ہے ہیں۔»

«بیٹے!» شریف بوا پھر مجھ سے خاطر بے ہو گیں: در پاکستان میں تو لوگ بڑی بڑی نوکریں کر رہے ہیں۔ تم لونڈے پڑھانے میں اپنی عمر کیوں گزار رہے ہو؟»

انی نے اس معاملے میں شریف بوا کی ایسی جو صداقتی نہیں کی۔ انہوں نے ذکر کی دوسرا پہنچ دیا۔ «شریف بوا! واں کا بھی تو کچھ حال سناؤ۔»

«واں کا حال؟» شریف بوانے ٹھنڈا سالہ: بھرا: «واں کا کہیں حال پوچھو ہو۔ واں ایسے ہے کون؟ بڑی حوالی میں تو اب شترار تھی آگئے ہیں۔ خان صاحب ولے لگھر میں تلاپڑا ہے۔ بچھوٹی جویلی بالکل ٹھنڈا ہو گئی ہے۔ بچھلی گرمیوں میں جب کالی آندر ہی آئی تھی تو اس کی فصل:

گورپڑی۔ بس جب سے انہا برا برا یک پھنسیے چار سے ترا ب علی اپنے ران
جمان گھر میں آئیں۔ گئے ہیں۔ سارا کینہ ادھر آگیا، وہ ایسے ٹوٹ دن ٹوں
بنجیے ہیں۔“

”اب تو وہ بہت بوڑھے ہو گئے، موں گے؟“

”والکل پھونس ہیں۔ ڈھنڈار گھر میں کھیا پہ پڑے کھانستے رہتے ہیں۔“

ڈھنڈا سالس بھرا:

”ایک وقت تھا کہ خانداں پھیلے جا رہے تھے اور بڑے بڑے گھر چھوٹے
لگنے لگے تھے۔ اب یہ وقت آیا ہے کہ خانداں سارے یکھر گئے۔ اب چھوٹے
گھر بھی بڑے لگتے ہیں۔ اب تھا راہی گھر ہے۔ وہاں اب کون رہ گیا ہے؟
توں بی او رچھوٹی دھی، دودم اور اتنا بردا اگھر۔“

”اچھا تو طاہرہ چلی گئی؟“

”ہاں، اس کامیاب چھلے بیٹتے ڈھاکہ سے آیا تھا، اسے لے گیا۔ اب وال سیدی کے
خط پر خط آرہے ہیں کہ تم بھی آ جاؤ۔“

”صلابرہ کی بھی کہیں بات چل رہی ہے؟“

”پیغام تو نئی جگہ سے آئے تھے اور میں نے تو توں بی کو کہا بھی تھا کہ دیکھ بی بی جو لارکا
مل جائے اس کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا کے فارس ہو جا۔ نظر کے بیان، پہ بیان کہ اچھا
بڑا دیکھا جلتے۔ لڑکے تو سیپ پاکستان چلے گئے۔“

”چھر؟“

”بی بی! اہما را کام تو سمجھانا تھا سو سمجھا دیا۔ باقی اپنا برا بھلا آدمی اپ ہی سمجھتا ہے!
پھر دیے لفظوں میں بولیں：“

”سنایہ ہے کہ صابرہ نے اشکار کر دیا۔“

” صابر متنے انکار کر دیا؟ ” امی تعجب سے بولیں :

” وہ ایسی لڑکی تو نہیں بھتی۔ ”

” کہتی ہے تو کہی کروں گی۔ میں نے سناتو تھا پیٹ لیا کہ مولیوں کے خاندان کی بیٹی اب دفر دیں میں جا کے تو کہی کرے گی! ”
” اچھا! ” امی پچھے چپ سی ہو گئیں۔

صابرہ کا ذکر میں نے کچھ شاپنگ نہیں کیا۔ اس ذکر پر اس کہہ تشریف بوا کی اوپنجی آواتر پنجی ہوتے ہوتے سرگوشی کی شکل اختیار کر کری بھتی۔ پھر اسی وقت عرفان نے کہ دروازہ کھل کھٹایا۔
” دیکھو! آج شیراز نہیں چلتا ہے! ”

” یکوں نہیں چلنا لیں چلتے ہیں۔ ” اور میں فوراً ہی عرفان کے ساتھ شیراز کے لئے

پل پڑا۔

شاید اب میرے یہاں بھی پچھے رہ جلتے والی چیزوں تیجھے کھسک گئی تھیں۔ ساتھے کی چیزوں نظر لوں میں بھتی جا رہی تھیں بیہ شہر اپنے شاد آباد ریستورانوں، گھنے پیڑوں اور بھرے بھرے بدن والی لبوں کے ساتھ میرے اندر سماں تھا اور اس شہر کا القش بھی تو دیکھتے دیکھتے بہت بدلتا تھا۔ وہ کوچے جانپنی جانپنکی، گردی پڑی عمارتوں کے ساتھ گردی ہوئی قیامت کا پتہ دے سہتھے موناں اب نبھی عمارتیں منئے مکینوں سے ہٹک رہی تھیں اور گلی کوچے ایک نئے شور سے مغور تھے۔ متر و کہ دکانوں پر بیٹھے ہوتے اب پہلے کی طرح اکھڑے اکھڑے نظر نہیں آتے تھے۔ اب تو یوں لگتا تھا کہ وہ سدا سے یہاں بیٹھے ہیں۔ بازاروں کے پرانے اور نووارا جزا و عناصر گھل مل چکے تھے۔ دکانیں، دکاندار، دکانوں میں سیماں و اسیاں، آتے جاتے تحریک، اپنے گھلے پھرتے سیلانی سب آپس میں گھل گھلا کر ایک وحدت بن چکے تھے۔

میں نے اس شہر میں ایک آوارہ گرد کی حیثیت سے آفرا کیا اور شیراز کو اپنا ڈبرا

بنایا۔ یا رجتنف راستوں اور مختلف بہانوں سے آتا تو اس طور پر میں اکٹھے ہو گئے کسی کے ساتھ بہ ہوا کہ پورا خاندان کسی متود کے مکان کے ایک کمرے میں یا ایک بردے میں قریبے ڈالے پڑا تھا۔ وہ اس نگ فضائی خلقانی ہو کر شہر کی وسعتوں میں بھلکتا پھرا جھکتا تاکہی شہر گھر طری میں شیراز میں داخل ہوا اور پھر بیہین کا ہور ہا۔ کسی کے ساتھ یہ گز ری کہ بڑا سامان کان الٹ ہو گیا۔ وہ اُس مکان کی وسعت سے خالق ہو کر گھر سے نکلا، شہر میں آوارہ پھرتا پھر راسی آوارگی میں شیراز کو دریافت کیا۔ کوئی تسلیم سے پہلے سے یہاں اپنے جدی مکان میں اچھا بھلا رہتا تھا مگر یہ گھر ایسے دردی کی اس نئی فضائی میں جدی گھر سے بھی اس کا اچاٹ ہوا اور وہ اپنی مرضی سے بکھرا بن اس ٹھیک پر آیا۔

ان دنوں جب بوری غلقتت بے ٹھکانا نظر آتی تھی، ہر ہم نے جانا کہ ہمارا ایک ٹھکانا ہے، جیسے جنم جنم سے شیراز میں دھونی رہائے ٹھیک ہیں اور ٹھیک رہیں گے جیسے یکم منظور ہو چکے اور یہ گھروں کو گھر اور یہ روزگاروں کو روزگار مل گیا تو ہم شیراز کے پاسی بے ٹھکانا نظر آتے لگے، جیسے شہر میں بس ہم ہیں جن کا کوئی گھر در نہیں ہے میں اپنی دنوں میں جیسے ہم یہ یہ عالم گزر رہے تھا، افضل ایک بے قرار روح بناؤ اور شراب سے شتا سا ہوا۔ عرفان کے لیے ہم زہر پیدا ہوا۔ ہاں سلامت اور اجمل ابھی شراب اور انقلاب کے ذائقوں سے آشنا نہیں ہوتے تھے۔ ابھی وہ صرف اٹلکچوں تھے اور شیراز میں بیٹھ کر صرف ادب اور آرٹ پر بحثیں کرتے تھے مگر اٹلکچوں، بخنوں میں سب سے بڑھ کر نام زوار نے پیدا کیا۔

زوارِ نام میں سب سے کم عمر تھا مگر اس نے ہمارے یونچ عالم فاضل بن کر اور بزرگانہ ننان اخیزار کر کے اپنی بھیگتی مسوں کی کماحتہ تلافی کر لی تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں اناپ شناپ کتابیں پڑھنے کے بعد اعلان کیا کہ الگی کتابیوں سے نہیں ملتی، زندگی کے سفر بولے کے گزر نے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ پھر تلاش آگئی میں اس نے افضل کے ساتھ پڑھ کر

مختوڑ سے دن شرایب سے شغل کیا۔ پھر اسے ناما فی جان کر چرس، ہگا سنجا اور افیون کو آزمایا۔ نہ لئے دھونے کو، ابھی کپڑے پینٹے کو، جامست بخوبی کو تعمیح اوقات جانا اور حتی الامکان ان فضولیات سے اجتناب کیا۔ جونا کچھ پرانا ہو گیا، کچھ پالش نہ ہونے اور دھول مٹی میں اٹ جانے سے پرانا نظر آتے رکھتا۔ اس کے پیے تابے اس نے خود کمال کر پھینک دیتے۔ جتنی کیا کیکلیں باہر نکل آئیں بیلوں بیدل چلتی، واپس شیراز آتا تو ایڈیاں لہو ملان ہوتیں۔ «یا ر تو کسی موجی سے جوتا کیوں نہیں ٹھکوا لیتا۔»

« نہیں۔»

« کیوں؟»

« آدمی بنتے کے لئے اذیت کے تجربے سے جویں گز رنا پاہی سے اور بیٹا آرت تو

SUFFERING

لیں اسی طرح اذیت کے نتیجے تجربے کہتا وہ نہیں۔ ایس پی کے امتحان میں پیٹھا اور کامیاب ہو گیا۔

« زوار ایسا گویا تم سی۔ ایس پی افسرِ الاحوال والا قوت۔»

« آخر تم اپنی مردی سے پیٹھیش میں بیٹھے ہو اور پاس ہوئے ہو۔»

« آدمی کو اس تجربے سے جویں گز رنا پاہی سے۔»

« اذیت کا نیا تجربہ۔، عرفان طمنہ بھری ہنسی ہنسا۔

ایس رات بھیگ چکی بھتی اور، ہم خاموش مال پر اپنے حال میں مگن چل رہے تھے۔

« یارو کچھ پتہ ہے کہ اب کیا بجا ہے؟»

زوار کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ پتہ ہو بھی جائے تو اس سے کیا فرق پڑے نہا؟،

« میرا مطلب ہے۔، میں نے کہا: آدمی کو رات کو کسی وقت سون جویں پا سینے۔»

» بشرطیکہ سونے کے لئے جگہ ہو۔ « عرفان نے ملکہ اگایا۔

زوال کویہ بات بھی ناگوار گزرنی:

» عرفان تم مجبوری کے تحت جائے ہو۔ جاگنا میری مجبوری نہیں، مبتدأ

« CHOICE ہے۔

» جاگنا و پیڑی سی۔ ایسی پی کے امتحان میں بلیٹھنا۔ « عرفان نے طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

زوال کامنہ سرخ ہو گیا۔ میں نے فوراً سلامت کی طرف منہ کر لیا۔ یادِ سلامت تیر اتو اچھا خاصا بڑا گھر ہے۔ تو ہمارے ساتھ کبوں خراب ہوتا ہے۔ «

» وہ گھر میرا نہیں، کسی سکھ کا ہے۔ «

» سکھ تو چلے کر۔ «

» کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُن کی جگہ میرے باپ نے لے لی ہے۔ «

اجمل کویسا بیک یاد آیا کہ یہیں اس پاس افضل کا گھر ہے۔ یا اگر واقعی کہیں پڑا و کرنا ہے تو افضل کا گھر قریب ہی ہے۔ «

» چلو پھر اُسی کو جگائیں۔ «

ہم چند قدم چل کر ایک گلی میں مڑتے اور بڑھ کر ایک دروازے پر دنکدی۔ (دواڑہ کھلا) افضل نے باہر نکل کر یہیں غور سے دیکھا۔

» پھر ہذا اس وقت تم کیوں آتے ہو۔ «

» سونے کے لئے۔ « میں نے کہا۔

» مگر میرے پاس کوئی فال تو چار پانی نہیں ہے۔ «

» ہم چار پانی کے زمانے سپہلے کے لوگ ہیں۔ «